تحقیق وتنقید

پروفیسر محمد دین قاسمی

قرآن فہمی اور حدیث نبوی ﷺ

'طلوعِ اسلام' کے 'محدث' کی تنقید میں لکھے گئے مباحث کا جائزہ

حصہ دوم

'طلوعِ اسلام' مئی ۲۰۰۵ء کے شمارہ میں خواجہ ازہر عباس صاحب ـــــ ''قرآن فہمی وحدیث نبویؐ'' مؤقر ماہنامہ محدث سے چند گزارشات ـــــ کے زیرعنوان فرماتے ہیں:

''قرآن فہمی کے اُصولوں اور قواعد کے سلسلہ میں محترم پرویز صاحب اور محترم جاوید غامدی صاحب کے حوالے سے مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب خورشید ندیم، پرویز صاحب کے قرآن فہمی کے اس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے جس کی رو سے وہ قرآن کریم کو صرف لغت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اس کے برخلاف طلوعِ اسلام جناب غامدی صاحب کے طریقہ کو کہ ''وہ قرآن کو جاہلی دور کے عربی ادب اور شعر وشاعری کے ذخیرے کی بنیاد پر سمجھنا چاہتے ہیں، درست خیال نہیں کرتا۔''[۲۸]

اس پر مولانا زاہد الراشدی صاحب فرماتے ہیں:

''جہاں تک فہم قرآن کے بنیادی تقاضوں کا تعلق ہے، اگرچہ لغت اور ادبِ جاہلی دونوں اس کی ضروریات میں سے ہیں، لیکن فہم قرآن کا انحصار ان دونوں پر یا ان میں سے کسی ایک پر نہیں ہے، یہ دونوں صرف معاون ہیں اور فہم قرآن تک رسائی کے ذرائع میں سے ہیں لیکن اس کی بنیاد جس چیز پر ہے، اسے دونوں حضرات فہم قرآن کی بنیاد کے طور پر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔''[۲۹]

اس پر مقالہ نگار، مولانا زاہد الراشدی کے اس نقطہ نظر پر یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

''ان دنوں حضرات (یعنی پرویز صاحب اور جاوید غامدی صاحب یا طلوعِ اسلام اور اشراق) کے اختلاف سے صاحبِ مضمون فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ صاحبِ مضمون کا یہ نظریہ ہے کہ ان دونوں ہی حضرات کا قرآن فہمی کا طریقہ غلط ہے، وہ (زاہد الراشدی صاحب) لغت اور ادبِ جاہلی اور محاوروں کو اہمیت تو دیتے ہیں، ان کی اہمیت سے صرفِ نظر

---

[۲۸] طلوع اسلام، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۳ تا ۲۴

www.KitaboSunnat.com

نہیں فرماتے، لیکن یہ خیال فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سہارے قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں۔''(۲۰)

مولانا زاہد الراشدی کے نزدیک قرآن فہمی کا صحیح اور مناسب طریقہ کیا ہے؟ اس کا خلاصہ مقالہ نگار یوں پیش فرماتے ہیں:

''قرآن فہمی کے سلسلہ میں مولانا زاہد الراشدی صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے متکلم کی منشا تک رسائی ضروری ہے۔ اس کیس میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے لیکن اس تک براہِ راست رسائی ممکن نہیں ہے کہ اس سے دریافت کیا جاسکے کہ آپ کی اس بارے میں کیا مراد ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ کے نمائندے تک تو ہماری رسائی ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اللہ تعالیٰ کی نمائندہ ہے جن کا مشن ہی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچائیں اور اس کی وضاحت کرکے ہمیں اللہ تعالیٰ کی منشا سے آگاہ کریں۔''

اسکے بعد حضرت نہایت معصومانہ انداز میں اس حیرت واستعجاب کا اظہار فرماتے ہیں کہ

''قرآن، اُمت تک جن ذرائع سے پہنچا ہے، وہی ذرائع اس کی تشریح یعنی جناب نبی ﷺ کے ارشادات وفرمودات کو ہم تک منتقل کررہے ہیں۔ اگر وہ ذرائع قرآن کریم کو اُمت تک منتقل کرنے میں قابل اعتماد ہیں تو حدیث وسنت کو اُمت تک پہنچانے میں کیوں قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اگر وہ حدیث وسنت کی روایت میں خدانخواستہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو قرآن کریم کی روایت میں کس طرح قابل اعتماد ہوجاتے ہیں۔''(۲۱)

مولانا زاہد الراشدی صاحب کے اس نظریہ پر 'روایت پرستی' کا لیبل چسپاں کرتے ہوئے مقالہ نگار فرماتے ہیں:

''غرض کہ اصل نظریہ حضرت کا وہی روایت پرستی کا حامل ہے کہ قرآن کریم کو روایت کے ذریعہ سمجھا جائے اور تفسیر القرآن بالروایت کا جو طریقہ ہمارے ہاں چلا آرہا ہے، اسی کو جاری رکھا جائے۔''(۲۲)

نفس مسئلہ سے مقالہ نگار کا گریز

اس کے بعد مقالہ نگار صاحب مولانا زاہد الراشدی صاحب کے اس موقف سے کہ ''قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کے فرمودات ہم تک ایک ہی ذرائع سے پہنچے ہیں، لہٰذا اگر وہ قابل اعتماد ہیں تو دونوں (قرآن اور روایاتِ حدیث) کو ہم تک پہنچانے میں قابل اعتماد ہیں اور اگر نا قابل اعتماد ہیں تب بھی دونوں کو ہم تک پہچانے میں نا قابل اعتماد ہیں۔'' صرفِ

www.KitaboSunnat.com

نظر کرتے ہیں اور یہ بحث شروع کردیتے ہیں کہ ''قرآن اور روایاتِ حدیث میں کیا کیا فروق وامتیازات پائے جاتے ہیں۔'' پھر فروق وامتیازات بھی وہ بیان کئے جاتے ہیں جو نفس مسئلہ سے قطعی غیر متعلق ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ جیسی ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الاَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ میں مرکزی نکتہ، انسانی زندگی اور بری جانوروں اور فضائی پرندوں کی حیات میں 'مثلیّت' کا پہلو ہے، لیکن بحث اس نکتہ کی بجائے یہ شروع کردی جائے کہ انسانوں کی زندگی اور زمینی جانوروں اور فضائی پرندوں کی حیات میں یہ اور یہ فرق پائے جاتے ہیں، لہٰذا ان سب کو ایک جیسا (مثلکم) قرار دینا درست نہیں ہے۔ یہاں زیر بحث نفس مسئلہ تو یہ ہے کہ جن ذرائع سے (مثلاً کتابت، حفظ وغیرہ سے) قرآن ہم تک پہنچا ہے، انہی ذرائع سے احادیثِ رسول بھی ہم تک پہنچی ہیں۔ مقالہ نگار ان ذرائع پر بحث کرنے کی بجائے یہ کہنا شروع کردیتے ہیں کہ ''قرآن اور روایاتِ حدیث میں تو یہ فرق بھی ہے اور وہ فرق بھی، لہٰذا دونوں متماثل نہیں ہیں۔'' مقالہ نگار نے جو فروق بیان کئے ہیں وہ اگر فی نفسہٖ درست بھی ہوں تب بھی وہ اصل مسئلہ سے غیر متعلق ہیں، یوں خلطِ مبحث میں اُلجھا دینے میں مقالہ نگار کی سادگی وپُرکاری واقعی قابل داد ہے!!

چند اُمور پر غور فرمایئے!

بہرحال اصل مسئلہ زیر بحث سے گریز کرتے ہوئے مقالہ نگار قرآنِ مجید اور حدیث وسنت میں باہمی فرق کو یہ کہہ کر واضح فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم پر ایمان لانے کے بعد پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ قرآن جو چھ ہزار سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے، کن ذرائع سے ہمارے پاس آیا ہے، اس کے برخلاف احادیث کا یہ مقام نہیں ہے۔[۲]

حالانکہ بحث کا اصل ہدف ''وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعہ ہم تک قرآن اور روایات احادیث پہنچی ہیں۔'' نہ کہ یہ امر کہ ''قرآن کا مقام کیا ہے اور احادیث کا مقام کیا؟''

تاہم یہاں اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہی بنیاد کی وہ غلطی اور کجی ہے جس پر انکارِ حدیث کے مسلک کا قصر فلک بوس تعمیر کیا گیا ہے۔ اگر کوئی سلیم الفطرت شخص جو واقعی متلاشی حق ہو، مسلکِ انکارِ حدیث کے لئے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے بالاتر ہوکر ٹھنڈے دل ودماغ سے یہاں غور کرے گا، تو اسے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا!!

---

② طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص۱۳ ③ ابلیس وآدم، ص۴۰

www.KitaboSunnat.com

❶ پہلے ایمان کس پر؟ قرآن پر یا رسولؐ پر

مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ ـــــ ''قرآنِ کریم پر ایمان لانے کے بعد، پھر یہ سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ یہ قرآن ... کن ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے۔'' دراصل اس مفروضہ پر قائم ہے کہ سب سے پہلے ہمارے پاس قرآن آیا۔ ہم فوراً ہی اس پر ایمان لے آئے۔ لہٰذا ایمان لا ڈالنے کے بعد اب یہ سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ یہ کن ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے۔''

حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ قرآن ہمارے پاس پہلے آیا ہو اور ہم اس پر ایمان لائے ہوں، پھر قرآن نے ہمیں محمد بن عبداللہ سے متعارف کروایا ہو، تب قرآن کے کہنے پر ہم نے اُنہیں محمد رسول اللہ ﷺ تسلیم کیا ہو۔ بلکہ واقعاتی صورتِ حال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس پہلے آئے، ہم ان کی رسالت پر ایمان لائے، تب ان ہی کے کہنے پر (حدیث رسولؐ کی بنیاد پر) ہم نے قرآن کو قرآن تسلیم کیا ہے۔ اب یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی جس زبان پر اعتماد کرتے ہوئے ہم نے قرآن کو قرآن مانا ہے، اُسی زبان کو ایمان بالقرآن کے فوراً بعد ہم نظر انداز کردیں اور خدائے کائنات کی طرف سے مامور من اللہ نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو سرکاری تشریح، زبان ترجمان وحی نے فرمائی ہے وہ یکسر مہمل اور بے معنی ہوکر رہ جائے۔

❷ کتاب کے ساتھ، بشر رسول ہی کیوں؟

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنی کتاب کے ساتھ رسول بھیجا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تنہا کتاب بغیر کسی رسول کے آئی ہو، حالانکہ اس کے برعکس یہ نہ صرف یہ کہ ممکن ہی ہے (بلکہ عملی واقعہ بھی ہے) کہ کوئی رسول، اپنی پیغمبرانہ زندگی میں، رسول ہونے کے باوجود، ایک مدت تک محرومِ کتاب ہی رہا ہو اور منصبِ نبوت پا لینے کے ایک مدت بعد اسے کتاب ملی ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہ تھا کہ اپنی کتاب براہِ راست قوم کے ہر فرد تک پہنچا دیتا؟ اگر وہ قادر نہ تھا تو اسے اللہ مانا ہی کیوں جائے؟ لیکن اگر وہ قادر تھا (اور بالیقین قادر تھا) تو کیوں نہ ہر فردِ قوم تک اپنی کتاب براہِ راست پہنچا دی؟ اور کیوں اس نے یہ ضروری جانا کہ کتاب کے ساتھ ایک رسول بھی بھیجا جائے؟ اور پھر رسول جب بھی بھیجا گیا تو کوئی فرشتہ نہیں، بلکہ انسانوں ہی میں سے بھیجا گیا۔ آخر یہ کیوں؟ ـــــ اس لئے کہ

www.KitaboSunnat.com

تنہا کتاب خواہ وہ کتنی ہی عظیم الشان ہوتی، بہرحال وہ الفاظ ہی پر مشتمل ہوتی جبکہ عملاً جو کچھ مطلوب ہوتا ہے، وہ الفاظِ کتاب نہیں بلکہ معانی کتاب ہوتے ہیں، جن کے تعین میں لامحالہ (اگر کتاب کے ساتھ رسول نہ ہو تو) لوگوں میں سے ہر فرد دوسرے سے مختلف ہوگا اور یہ اختلافِ معانی ٔ کتاب لوگوں کو نہ تو بنیانِ مرصوص ہی بنا سکے گا نہ ہی انہیں اقامتِ کتاب (یا غلبہ دین) کی منزل تک پہنچا سکے گا۔ مگر رسولؐ کی موجودگی میں کتاب کا وہی مفہوم 'سرکاری فرمان' قرار پائے گا جو خود رسولؐ کا پیش کردہ ہو، کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ خدا کا مامور من اللہ نمائندہ ہے بلکہ اس کتاب کا شارح مجاز بھی ہے۔ لیکن کتاب کی ایسی توضیح وتشریح جو صرف بیان وکلام کی حد تک ہو، وہ تو خیر ایک فرشتہ بھی کرسکتا ہے لیکن جو تشریح و وضاحت عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کی محتاج ہو وہ کوئی فرشتہ اس لئے انجام نہیں دے سکتا کہ اس کی دنیا انسانی دنیا سے یکسر مختلف ہے اور انسان سے قطعی الگ اور جداگانہ مخلوق ہونے کی بنا پر وہ انسان کے لئے نمونۂ پیروی نہیں بن سکتا۔ انسانوں کی دنیا میں تو کوئی انسان ہی اُن کے لئے اُسوۂ حسنہ بن سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے کتاب کے ساتھ کسی فرشتہ کی بجائے انسان ہی کو رسول اور راہنما بنا کر بھیجا ہے۔ اسی بات کو جناب پرویز صاحب نے بھی بڑے اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''اگر غور وفکر اور ہدایت ونجات کے لئے کتاب کی آیات ہی کافی ہوتیں تو کتاب کسی پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دی جاتی، عوام کے دلوں میں اِلقا کردی جاتی (جیسا کہ وہ اکثر اعتراض بھی کرتے تھے کہ ہم پر وحی کیوں نہیں بھیجی جاتی) لیکن اس علیم وحکیم کو خوب معلوم تھا کہ تعلیم بلا عمل اور کتاب بلا رسول ناقص رہ جاتی ہے۔ یہی ضرورت تھی جس کو پورا کرنے کیلئے فرمایا کہ
> ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (احزاب:۲۱)
> ''تمہارے لئے رسول اللہ (کی زندگی) میں عمدہ نمونہ ہے۔''(۳۳)

۳ اُسوہ ...... الفاظِ کتاب یا ذاتِ رسولؐ؟

تیسری بات جو یہاں ذہن نشین رہنی چاہئے وہ 'اُسوۂ حسنہ' کا محل ومہبط ہے۔ قرآنِ کریم نے صرف دو ہی رسولوں کو اہل ایمان کے لئے بالصراحت اُسوہ حسنہ قرار دیا ہے: ایک حضرت محمد ﷺ اور دوسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام (اور ان کے اصحاب) حضرت ابراہیم علیہ

⑦ طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۳ ⑧ لغات القرآن (پرویز) ص ۳۳۶

www.KitaboSunnat.com

السلام کو جو کتاب (جسے قرآن نے 'صحفِ ابراہیم' کہا ہے) دی گئی تھی، وہ آج مسلمان تو کیا کسی بھی قوم کے پاس نہیں ہے۔ سو اگر اُسوہ کا مقصد (یا منکرین حدیث کی زبان میں اطاعت رسول کا مقصد) کتاب ہی کی پیروی ہوتا تو پھر آج اُسوۂ ابراہیمی کہاں سے لیا جاتا۔ خود قرآن مجید نے بھی صحفِ ابراہیم کے الفاظ و متن کو اپنے دامن میں محفوظ نہیں رکھا، بلکہ اس کی بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعمالِ حیات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور انہی اعمال کی بنیاد پر وہ آج بھی اُمت ِمسلمہ کے امام اور ملتِ ابراہیمی کے بلند پایہ قائد قرار دیئے گئے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے نقوش و الفاظ اُسوہ نہیں بن سکتے۔ بلکہ نبی کے اعمالِ حیات اور رسولؐ کے نقوشِ قدم ہی اُسوہ بن سکتے ہیں اور پیغمبر کے افعال و اعمال کا نمونہ ہی لائق پیروی ہوسکتا ہے۔ یقیناً قرآن میں بھی حضور اکرم ﷺ کے اعمال و افعال بھی موجود ہیں لیکن قرآن سے کہیں زیادہ یہ ریکارڈ احادیث میں پایا جاتا ہے۔

۴ رسولؐ؛ مامور من اللہ شارحِ قرآن

چوتھی بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ کتاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو بھیجا ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟ قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے (اے رسول!) تیری طرف یہ ذکر نازل کیا، تاکہ تُو لوگوں کے لئے اُس چیز کی وضاحت کردے جو ان کی طرف اُتاری گئی۔''

اس آیت پر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جو قیمتی، ایمان افروز اور مزیل شبہات حاشیہ لکھا ہے اس کا ایک حصہ ملاحظہ فرمایئے:

''یہ آیت جس طرح ان منکرین نبوت کی حجت کے لئے قاطع تھی جو خدا کا 'ذکر' بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے، اسی طرح آج یہ ان منکرین حدیث کی حجت کے لئے بھی قاطع ہے جو نبی کی توضیح و تشریح کے بغیر صرف 'ذکر' کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی، صرف 'ذِکر' پیش کردیا تھا یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف 'ذکر' ہے نہ کہ نبی کی تشریح یا اس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لئے صرف 'ذِکر' کافی ہے، نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف 'ذِکر' ہی قابل اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے، نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے۔ غرض ان چاروں باتوں میں سے وہ جس بات کے بھی

⑨ معارف القرآن، ج۳ص۴۹۲، ۵۴۹، ۵۵۱ ⑩ ایضاً: ج۳ص۵۵۳ ⑪ طلوع اسلام، ستمبر ۱۹۷۳ء ص۴۴

www.KitaboSunnat.com

قائل ہوں، ان کا مسلک بہرحال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔

اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی نے اس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہِ راست لوگوں تک پہنچا دینے کی بجائے اسے واسطہ تبلیغ بتایا گیا تھا۔

اگر وہ دوسری اور تیسری بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے (معاذ اللہ) یہ فضول حرکت کی کہ اپنا 'ذکر' ایک نبی کے ذریعہ بھیجا کیونکہ نبی کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبی کے بغیر صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہوجانے کا ہوسکتا تھا۔

اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوتِ محمدیؐ دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلک معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ ان لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآنِ مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لئے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھہرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کررہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرین حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح وتشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں: پہلا یہ کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے، نبوتِ محمدی ختم ہوگئی اور ہمارا تعلق محمد ﷺ کے ساتھ صرف اس طرح کا رہ گیا جیسا ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر ان کا کوئی اسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز ایک نئی نبوت کی ضرورت، آپ سے آپ ثابت کردیتی ہے۔ صرف ایک بے وقوف آدمی ہی اس کے بعد ختم نبوت پر اصرار کرسکتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن نبی کی تشریح وتبیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لئے ناکافی ہے، اسلئے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اسے بجائے خود کافی قرار دیں، مدعی سست کی حمایت میں گواہانِ چست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ، خود قرآن کی رُو سے ثابت ہوجاتی ہے۔ قاتلھم اللہ اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔''[35]

الغرض، یہ آیت ذِکر بلا تبیین رسولؐ، تعلیم بلا عمل، کتاب بلا رسول اور قرآن بلا محمد (ﷺ) کے نظریہ کی سخت مخالفت کرتی ہے۔ اب اس کے بعد ایک نظر ان فروق وامتیازات پر ڈال لیجئے جنہیں مقالہ نگار نے قرآن اور احادیث کے حوالہ سے بیان کیا ہے:

www.KitaboSunnat.com

روایاتِ حدیث اور منکرین حدیث

رہا مقالہ نگار کا یہ فرمان کہ ''ہم احادیث پر ایمان لانے کے مکلّف نہیں ہیں۔'' تو اس کی وضاحت قدرے آگے چل کر وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے..... لیکن اس کے برخلاف نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے، نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کے رواۃ پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔''[۱۷]

سبحان اللہ! کیا بلند مرتبہ ہے آپ لوگوں کا اور کیا اونچی شان ہے آپ حضرات کی! گویا قرآن براہِ راست اللہ میاں کے ہاتھوں سے آپ کو ملا ہے ورنہ اگر سینکڑوں، ہزاروں اور کروڑوں افراد کے تواتر سے آپ تک قرآن پہنچا ہے تو ان کروڑوں راویوں کے توسط سے آپ تک قرآن پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کروڑوں افراد پر آپ کا ایمان ہوجائے اور ان سب پر ایمان لانے کا آپ کو حکم دیا گیا ہو۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ آپ کی آغوشِ مبارک میں قرآن ٹپکا دیا ہے اور پھر آج سے آپ ہرگز کسی خبر دینے والے کی خبر اور کسی شاہد کی شہادت کی طرف کان بھی نہ دھریئے گا، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اس خبر رساں اور اس شاہد پر ایمان لا رہے ہیں جس کا اللہ نے آپ کو حکم نہیں دیا ہے اور یہ جو ہمیشہ سے دنیا بھر کی عدالتوں میں شاہدوں کے بیانات اور ان کی شہادتیں سنی اور قبول کی جاتی رہی ہیں، آپ جیسے نکتہ سنج حضرات کے نزدیک سارے قضاۃ کرام اور جج صاحبان ان شاہدوں پر ایمان ہی لایا کرتے ہیں حالانکہ ایسی 'غیر یقینی اور غیر ایمانی چیزوں' پر ایمان لانے کا اُنہیں حکم ہی نہیں دیا گیا۔ مزید آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ حضورِ اکرم ﷺ اور خلفاے راشدین نے کسی مخبر کی خبر پر اگر اعتبار و اعتماد کیا تھا یا کسی گواہ کی گواہی کو قبول کیا تھا تو مقالہ نگار کی اس عجیب منطق کی رو سے رسولِ اللہؐ بھی اور خلفاے راشدین بھی مخبر و شاہد پر ایمان لانے والے ٹھہرتے ہیں اور یہ جو ۲۹/ دسمبر ۱۹۵۵ء کو کسی نے ٹیلیفون پر پرویز صاحب کو یہ اطلاع دی کہ اسلم جیراجپوری فوت ہوگئے اور پرویز صاحب نے اس اطلاع کو قبول کیا اور بعد میں طلوعِ اسلام کا ایک پورا شمارہ 'اسلم جیراجپوری نمبر' کے طور پر شائع کیا تو اس خبر کو قبول کرنا

---

[۱۷] طلوع اسلام، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۳

www.KitaboSunnat.com

اطلاع دہندہ پر ایمان لانا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا مقالہ نگار اور ان کے ہم نوا منکرین حدیث نے ساری دنیا کو جاہل اور احمق سمجھ لیا ہے یا یہ ان کے مبلغ علم کا کرشمہ ہے جو ایسے مضحکہ خیز 'نوادرات' ان کے قلم سے صادر ہو رہے ہیں۔

ایسی بات جیسی منکرین حدیث پیش کر رہے ہیں، اگر کسی کے لئے کہنا سزاوار ہوتا تو یقیناً وہ صحابہ کرامؓ ہی ہو سکتے تھے کیونکہ وہی قرآن کے اوّلین مخاطب تھے لیکن اُنہوں نے یہ بات صرف اور صرف اس لئے نہیں کہی کہ آپ ﷺ کو نبی و رسول تسلیم کر لینے کے بعد وہ زبانِ رسول سے برآمد ہونے والے ہر لفظ کو کلمہ حق سمجھتے تھے اور یہ اعتقاد کہ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلنے والی ہر بات امر حق اور مطابق مرضاتِ الٰہی ہے۔ قرآنِ کریم اور فرمانِ رسول ﷺ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ رہا آپ ﷺ کا فرمان تو آپ نے خود اپنے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو جو کچھ لوگوں کی طرف سے غلط فہمی کی بنا پر فرموداتِ رسول ﷺ کو لکھنا چھوڑ بیٹھے تھے، یہ فرمایا تھا کہ «اكتب فوالذي نفسي بيده لا يخرج منه إلا حق» "تم لکھتے رہو، اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس (منہ) سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔" رہا قرآن تو وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ "وہ (رسول) اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو کر نہیں بولتا بلکہ وہ تو سراسر وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔" اس آیت کی تفسیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جو کچھ قلم بند فرمایا ہے، وہ فی الواقع بیمار کی شفایابی اور پیاسے کی سیرابی کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے اور منکرین حدیث کے شکوک و شبہات کا بہترین ازالہ ہے۔ لیکن یہ اقتباس چونکہ بہت ہی طویل ہے، اس لئے میں اس مقالہ میں اسے پیش کرنے کی گنجائش نہیں پاتا۔ طالبین ذوقِ تحقیق، تفہیم القرآن، جلد پنجم، سورۃ النجم صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۵ کا مطالعہ خود فرما سکتے ہیں۔

قرآن یقینی، مگر روایات 'ظنی'

مقالہ نگار بھی ان منکرین حدیث کے ہم نوا ہیں جو قرآن کے یقینی اور روایات کے ظنی ہونے کی دہائی دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

"قرآنِ کریم از اوّل تا آخر سورۃ البقرۃ سے لے کر سورۃ الناس کے آخر تک یقینی ہے، اس کی جملہ آیات یقینی و حتمی ہیں جبکہ شانِ نزول اور روایات بالکل ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ اس صورت میں آیات کی تفسیر کا مدار و انحصار روایات اور شانِ نزول پر رکھنا بالکل غیر مناسب اور

www.KitaboSunnat.com

عقل کے خلاف ہے اور آیات کے مفہوم کو بھی غیر یقینی اور ظنی بنانا ہے۔''[۱۷]

اس اقتباس میں پہلی بات تو یہ کھٹکتی ہے کہ مقالہ نگار نے سورۃ الفاتحہ کو قرآن سے خارج کر دیا ہے اور آغازِ قرآن، سورۃ البقرہ کو اور اختتامِ قرآن سورۃ الناس کو قرار دیا ہے، نہ معلوم یہ کیوں؟ اب رہا قرآن کے یقینی اور روایات کے ظنی ہونے کا معاملہ تو یہاں اصل اور بنیادی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ

''صرف الفاظِ قرآن ہی یقینی اور حتمی ہیں؟ یا ان الفاظ کا معنی ومفہوم بھی؟''

اگر آپ الفاظِ قرآن ہی کے حتمی اور یقینی ہونے کے قائل ہیں تو یہ امر تمام مسلمانوں میں (بلکہ غیر مسلموں میں بھی) متفق علیہ ہے، اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے لیکن اگر آپ الفاظِ قرآن کے معنی ومفہوم کو بھی حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں تو آپ کا یہ نظریہ وہم وگمان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کوئی بڑے سے بڑا منکرِ حدیث حتیٰ کہ خود پرویز صاحب بھی اس کے مدعی نہیں ہوسکتے۔ اگر متن قرآن کا مفہوم و مدلول بھی حتمی اور یقینی ہوتا تو تفسیر قرآن کا قطعاً اختلاف نہ ہوتا۔ منکرین حدیث کے جملہ گروہوں میں خواہ وہ ماضی کے احزاب ہوں یا دورِ حاضر کے ٹولے ہوں، یہ اختلاف موجود رہے ہیں (باوجودیکہ ہر ٹولہ تمسک بالقرآن ہی کو رافع اختلاف قرار دیتا رہا ہے) حتیٰ کہ عبادات وعقائد تک میں اور فروعی نہیں بلکہ اُصولی امور تک میں یہ افتراقات وتنازعات اب تک برقرار ہیں اور اِنہی کی بنیاد پر خود پرویز صاحب منکرین حدیث کے دوسرے گروہوں کو گمراہ، دشمن دین اور مُخْزِي القرآن قرار دیتے رہے ہیں۔ پھر یہ تفسیری اختلافات مسلکِ انکارِ حدیث کے علمبردار مختلف دھڑوں ہی میں نہیں پائے جاتے، بلکہ ان کے کسی ایک ہی گروہ میں بھی وقتاً فوقتاً موجود رہے ہیں اور پرویز صاحب کا تو خیر سے پورا لٹریچر ہی ماشاء اللہ ان ہی اختلافات کی بنیاد پر تضادات وتناقضات سے اٹا پڑا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ ہی حتمی ویقینی ہیں، مگر ان کا معنی ومفہوم ہرگز ہرگز حتمی اور یقینی نہیں ہے، پرویز صاحب خود ایک مقام پر یہ لکھتے ہیں کہ

''قرآن تو وحی الٰہی ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو کبھی وحی الٰہی قرار نہیں دیتا، اس لئے اس میں سہو اور خطا دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ بنابریں میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے اور وحی الٰہی کی طرح منزہ عن الخطاء''[۱۸]

---

⑱ معارف القرآن، ج۳، ص۲۰۲ تا ۲۰۳

www.KitaboSunnat.com

جب پرویز صاحب کے نزدیک بھی انسانی تعبیر قرآن سہو وخطا کا امکان رکھتی ہے اور وہ تعبیر وتفسیر وحی الٰہی کی طرح منزہ عن الخطا نہیں ہے تو پھر اس کے ظنی اور غیر یقینی ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے؟

الغرض، قرآن کے الفاظ تو بلا شبہ قطعی، حتمی اور یقینی ہیں لیکن ان کا مفہوم ومراد ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ وہ ظنی اور غیر یقینی ہے اور عملی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اتباعِ قرآن اور پیروی کتاب اللہ کے لئے ہم الفاظِ قرآن سے کہیں زیادہ مفہومِ قرآن کے محتاج ہیں جو بہرحال ظنی ہی ہے۔ لہٰذا یہاں عملاً دین میں حجت اور سند وہ چیز (مفہوم آیاتِ قرآن) بن رہی ہے جو غیر یقینی اور ظنی ہی ہے۔ جب عملاً صورتِ حال یہ ہے تو پھر حدیث وسنت نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ بقول آپ کے ظنی اور غیر یقینی ہونے کی بنا پر حجت اور سند سے محروم ہوجائے؟ کیا منکرین حدیث یہ کہنا چاہتے ہیں کہ روایاتِ رسولؐ اور احادیثِ نبیؐ تو ظنی ہونے کی بنا پر مردود ومسترد ہیں لیکن پرویز صاحب کی قرآنی تعبیرات ظنی ہونے کے باوجود مقبول ومحمود ہیں؟

اختلافِ سنت کا پراپیگنڈہ

منکرین حدیث سنت کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لئے یہ غوغا آرائی بھی کیا کرتے ہیں کہ

''ان حضرات (علما) کے نزدیک قدرِ مشترک صرف لفظ 'سنت' ہے، اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔''[19]

اور اسے خوب نمک مرچ لگا کر پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے ''سنت کی تعریف وتعبیر میں علما کرام کے درمیان شدید اختلافات ہیں، ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے اور پھر اس کی تعبیر بھی جدا جدا ہے، ایک فرقہ سنت کی جو تعبیر پیش کرتا ہے، دوسرا اسے تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اس کے برعکس قرآن کے متن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہر مخالف وموافق کے نزدیک وہی متن قرآن متفق علیہ ہے جو مابین الدفتین موجود ہے، وغیرہ وغیرہ''

لیکن اگر قرآن کوئی جنتر منتر کی چیز نہیں ہے اور وہ کوئی ایسی کتاب بھی نہیں جس کا متفق علیہ مفہوم تعویذ بن کر پلائی جانے والی چیز ہو، بلکہ عمل کرنے کے لئے ایک دستور العمل ہے تو پھر منکرین حدیث کے اس مکروہ پراپیگنڈہ میں کیا وزن رہ جاتا ہے جبکہ متن قرآن کے متفق

---

[19] مفہوم القرآن، ج۲ص۷۰۵ [20] مفہوم القرآن، ج۲ص۷۰۶

www.KitaboSunnat.com

علیہ ہونے کے باوجود اس کے مفہوم میں اختلافات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جب عمل کی طرف آمادہ ہوں گے تو یہ عمل اس معنی ومفہوم اور مراد و مدلول پر قائم ہوگا جو قرآنی متن سے کسی نے اخذ کیا ہوگا۔ غلام احمد پرویز کا عمل اس معنی ومفہوم پر ایستادہ ہوگا جو ان کی 'قرآنی بصیرت' نے قرآن سے نچوڑا ہوگا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عمل کی بنیاد اس مدلول ومراد پر ہوگی جو اُنہوں نے متن قرآن سے کشید کیا ہوگا، ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے حجت وسند وہی معنی ومفہوم ہوگا جو اس کے نزدیک ماخوذ من القرآن ہوگا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی حجت اور سند کا منکر ہوگا۔ پرویز صاحب کا مفہوم خود اس کے لئے دلیل وحجت ہوگا اور وہ مرزائے قادیانی کی حجت وبرہان اور جس معنی ومراد پر یہ حجت وبرہان قائم ہوگی، اس کا انکار کریں گے۔ اور یہی طرزِ عمل مؤخر الذکر فرد کا پرویز صاحب کے بارے میں ہوگا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر ایک کا قرآن سے اخذ کردہ مفہوم ومراد اور اس پر تعمیر ہونے والی دلیل وحجت خود اسی کے لئے ہی سند ہوگی اور ہر کوئی دوسرے کے مراد ومفہوم اور اس کی دلیل وبرہان کا منکر ہوگا اور پھر ہر ایک کا قرآن سے نچوڑا ہوا مدلول ومفہوم ظنی اور غیر یقینی ہی ہوگا اور جو سند وحجت ہوگی، وہ بھی ظنی ہی ہوگی تو پھر سنت کے خلاف یہ واویلا اور یہ غوغا آرائی کیسی؟ لہٰذا اب اگر سنت کے معاملہ میں مبینہ اختلاف فی نفسہٖ حدیث وسنت کو قابل رد بنا دینے پر محکم دلیل بن سکتا ہے اور سرے سے سنت ہی کا کوئی مقام باقی نہیں رہنے دیتا تو پھر عملی دنیا میں 'قرآنی بصائر ومعارف' کے درمیان، متضاد اختلافات کا وجود بھی قرآن کو ناقابل سند وحجت بنانے کے لئے ایک محکم دلیل بن سکتا ہے اور عمل کے باب میں 'قرآنی معارف وحقائق' کا آپس میں تصادم قرآن کے لئے بھی دینی مقام باقی نہیں رہنے دے گا۔

یہاں منکرین حدیث کی ذہنیت کا یہ پہلو بھی لائق دید اور قابل داد ہے کہ وہ سنت کی بابت اختلافاتِ علما کا تو خوب ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن خود ان کی صفوں میں (مختلف گروہوں کے درمیان) قرآن کی تعبیر وتفسیر میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا نہ صرف یہ کہ ذکر نہیں کرتے بلکہ اس عدمِ ذکر کے ساتھ ساتھ اُلٹا یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ قرآن ہی رافع اختلاف اور مزیل تنازعات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی قرآن ان سب کے درمیان اختلافات ختم کر چکا ہے؟ اور یہ مختلف گروہ کسی ایک تعبیر قرآن پر متحد ومتفق ہو چکے ہیں؟ کیا واقعی طلوعِ اسلام اور بلاغ القرآن والے ٹولے، براساس قرآن، شیر وشکر ہو چکے ہیں؟

www.KitaboSunnat.com

مقالہ نگار اور مسئلہ شانِ نزول

مقالہ نگار صاحب منکرین حدیث کی ہم نوائی میں شان نزول کی بنا پر تفسیر کرنے کے خلاف ہیں، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

''قرآن فہمی کی راہ میں شانِ نزول کو اس قدر اہمیت دینا ہی ہمارے نزدیک قرآن فہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔''(۴۰)

شان نزول کا مسئلہ منکرین حدیث کے لئے ہمیشہ سوہانِ روح بنا رہا ہے، وہ بڑی بلند آہنگی سے اس کا انکار بھی یہ کہتے ہوئے کرتے ہیں کہ شانِ نزول کی روایات بالکل ظنی اور غیر یقینی ہیں، لیکن اس کے باوجود جہاں ضرورت پڑتی ہے وہ خود اپنی طرف سے شانِ نزول گھڑ لینے میں بھی کوئی دریغ نہیں کرتے۔ اس کی بہت سی مثالیں اگرچہ موجود ہیں مگر مقالے کی تنگ دامنی کے باعث صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے جس میں 'مفکر قرآن' صاحب نے خود شانِ نزول گھڑا ہے، اس کے باوجود کہ وہ یہ اعلان بھی کیا کرتے تھے کہ

''خدا کی یہ عظیم کتاب اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے نہ تو شانِ نزول کی محتاج ہے اور نہ کسی اور ترتیب کی، یہ خود مُکتفی ہے اور اپنی وضاحت آپ کرتی چلی جاتی ہے۔''(۴۱)

سوال یہ ہے کہ اگر یہ کتاب ایسی ہی خود مکتفی ہے کہ ''اپنی وضاحت، آپ کرتی چلی جاتی ہے'' تو پھر پرویز صاحب کی یہ 'تفسیر مطالب الفرقان' یہ 'مفہوم القرآن' یہ 'تبویب القرآن' یہ 'قرآنی قوانین' یہ 'قرآنی فیصلے' اور یہ 'سلسلہ ہائے معارف القرآن' کیا محض قتل اوقات (Time Killing) کے پیش نظر ہی منظر عام پر آئے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ زبان پر تو 'کتاب عظیم کے خود مکتفی' ہونے کے اعلانات ہوں لیکن دل میں یہ اعتقاد جما بیٹھا ہو کہ یہ کتاب کسی 'مفکرِ قرآن' کی تشریحات وتوضیحات کی محتاج ہے۔

بہرحال 'قرآن کے خود مکتفی' ہونے کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود پرویز صاحب جن آیات کی تفسیر وتوضیح کے لئے تسویل نفس کے بل بوتے پر 'شانِ نزول' گھڑنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں، ان میں آیتِ نسخ بھی شامل ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ان اہل کتاب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہو، نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں''(۴۲)

www.KitaboSunnat.com

آیت کا یہ 'شانِ نزول' خواہ کتبِ احادیث میں سے ماخوذ ہو یا خودساختہ ہو، بہرحال اس بات کی دلیل ہے کہ سببِ نزول کے بغیر قرآن فہمی اور توجیہِ آیات ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہ 'شانِ نزول' نہ تو قرآن ہی میں مذکور ہے اور نہ ہی کتبِ احادیث میں۔ آیت نسخ کو اپنے مزعومہ تصور میں ڈھالنے کے لئے اسے 'مفکرِ قرآن' صاحب نے خود گھڑا ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ قولاً یہ بات خواہ کتنی ہی چیخ و پکار کے ساتھ کہی جائے کہ ''قرآن خود مکتفی ہے''، لیکن عملی زندگی میں یہ 'نظریۂ ضرورت' کا کبھی شدید تقاضا بھی بن جاتا ہے اور اسی لئے اسے اپنی طرف سے تراش بھی لیا جاتا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ 'مفکرِ قرآن' صاحب اور منکرین حدیث کو نفس 'شانِ نزول' سے انکار نہیں ہے۔ انہیں انکار اور ضد وعناد دراصل اس شانِ نزول سے ہے جو روایاتِ حدیث میں مذکور ہو، رہا وہ شانِ نزول جو ان کا خودساختہ ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ مبغوض نہیں ہے بلکہ وہ مرغوب ومحبوب بھی ہے!!

مسئلہ نسخ آیات اور مقالہ نگار

مقالہ نگار صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب کی تردید ومخالفت کے دوران تفاسیر میں عیوب واسقام کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''تفسیر بالروایات کے طریقہ میں کہ جس کی تائید وتوصیف حضرت مولانا زاہد الراشدی فرما رہے ہیں، ان عیوب واسقام کے علاوہ ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ یہ تفاسیر نسخ کے عقیدہ کی حامل ہیں ......''[۴۳]

اس 'بہت بڑے نقص' کی نشاندہی کے بعد نسخ کا مفہوم کسی عالم دین کے قلم سے پیش کرنے کی بجائے اپنی طرف سے بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

> ''......جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآنِ کریم میں کسی بات کا حکم کردیا، اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کردینا چاہئے چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل فرمادی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا۔''[۴۴]

نسخ کا یہ مفہوم کس عالم دین نے بیان کیا؟ کہاں بیان کیا؟ کس کتاب میں مذکور ہے؟ کس مجلّہ میں تحریر ہوا ہے؟ کس اخبار میں بیان ہوا؟ کس دور کے کس مفسر، محدث یا متکلم نے بیان کیا؟ اس کا کہیں سے بھی کوئی حوالہ؟ ـــــ حرام ہے جو کہیں بیان کیا گیا ہو، بس اپنی طرف سے ایک مفہوم گھڑا اور اسے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ علما کی طرف منسوب کرڈالا۔ منکرین

www.KitaboSunnat.com

حدیث ایسی حرکتیں اکثر کرتے رہتے ہیں، لیکن ان پر پردہ ڈالے رکھنے، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ، کے مصداق ڈھنڈورا یہ پیٹنا شروع کردیتے ہیں کہ

''ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ 'طلوعِ اسلام' کہتا ہے، اسے اس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کرکے اس پر قرآن کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کرکے گالیاں دینا شروع کردیتے ہیں۔''[۴۵]

حالانکہ یہاں خود ان حضرات کا یہ 'قرآنی اخلاق' کھل کر سامنے آرہا ہے کہ نسخ کے مفہوم کو کسی عالم دین کے اپنے الفاظ میں بیان کرنے سے تو گریز کیا جارہا ہے اور تسویل نفس کے ذریعہ ایک غلط مفہوم وضع کرکے اسے علما کرام کے گلے مڑھا جارہا ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) ناقص العلم ہونے کا تاثر اُبھر آئے۔

علماءِ تفسیر جس قسم کے نسخ کے قائل ہیں، وہ مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہے:

''نسخ کی گنجائش جو کچھ بھی ہے، لے دے کے باب احکام میں ہے اور احکام کی مثال طبیب کے نسخے کی ہے۔ طبیب کی تشخیص اپنی جگہ بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب و ہوا میں بھی فرق ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزا میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا۔ قرآن کے بعض احکامِ قانون کے نسخ کے معنی اس قدر ہیں کہ خود قانون ساز وقانون آفرین کے قلم سے عین وضع قانون کے دوران میں بعض قانون جو عارضی اور ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں، بدل دیے گئے اور ان کی جگہ مستقل اور دوامی قوانین نے لے لی۔''[۴۶]

لیکن منکرین حدیث، اللہ تعالیٰ کے نقص علم کے حوالہ سے خود اپنی طرف سے مفہومِ نسخ گھڑتے ہیں اور اسے علما کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ قارئین کرام یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ حرکت اتفاقی اور لاشعوری طور پر صرف یہاں ہی واقع ہوگئی ہے، نہیں بلکہ یہ ان حضرات کی مستقل، دائمی، دیدہ دانستہ، ایک مستمر عادت ہے، جس کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں:

بہرحال، اس کے بعد مقالہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ

''......لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نئی آیت میں یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ کیا جاتا ہے، اس لئے اب قرآن میں منسوخ آیات بھی ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ کون سی آیت کس آیت سے منسوخ ہے

www.KitaboSunnat.com

اور کون سی آیت کس آیت کی ناسخ ہے، یہ ناسخ ومنسوخ کی نشاندہی، روایات کے ذریعہ ہمارے مفسرین کرام نے کی ہے۔''[۲۵]

مقالہ نگار نے یہاں جو کچھ فرمایا ہے وہ اصل حقیقت پر غور کئے بغیر 'مفکرِ قرآن' صاحب کی اندھی تقلید میں مکھی پر مکھی مارنے کے مصداق ہے۔ اگر وہ الفاظ کے پیچوں میں اُلجھنے کی بجائے مسئلہ نسخ میں فنی اصطلاحات کے پردوں کو اٹھا کر عروسِ حقیقت کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے تو اُنہیں معلوم ہوتا کہ علماء اُمت ہوں یا پرویز صاحب، قرآنی آیات میں موجود بظاہر تعارض کے دونوں قائل ہیں۔ دونوں فریقوں کے نزدیک قرآن کریم کی بعض آیات، متروک العمل ہیں۔ ایک فریق ایسی آیات کو یہ کہہ کر متروک العمل قرار دیتا ہے کہ ''یہ آیات منسوخ ہیں'' اور دوسرا فریق یہ کہہ کر کہ ''یہ احکام عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سے معاشرہ گزر کر اگلی منزل پر پہنچ چکا ہے۔'' انفرادی ملکیت کے مسئلہ پر پرویز صاحب کے نقطہ نظر سے (نہ کہ علما کے نقطہ نظر سے) قرآنی آیات میں اختلاف وتعارض پایا جاتا ہے، وہ اگر ایک طرف قرآنِ کریم سے (آیت ۲/۲۱۹ کی روشنی میں) ذاتی اور نجی مال کی ملکیت کی نفی 'ثابت' کرتے ہیں تو دوسری طرف (آیت ۴/۳۲ کی روشنی میں) مرد وزن ہر دو کے حق میں شخصی ملکیتِ مال کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں قرآنی آیات کے باہم متعارض ہونے کی توجیہ کی جائے تو علماء کرام کے نقطہ نظر سے (بشرطیکہ دونوں آیات سے ان کا استدلال بھی، استدلالِ پرویز کے موافق ہو، تو) ناسخ ومنسوخ کے اُصول پر ہوگی اور پرویز صاحب کے نقطہ نظر سے ''عبوری دور کے احکام'' کے اُصول پر ہوگی۔

اس صورتِ حال میں کیا یہ بات قابل تعجب اور موجبِ حیرت نہیں کہ ایک ہی حقیقت کو اگر علمائے کرام، ناسخ ومنسوخ کے حوالہ سے بیان کریں تو 'مفکرِ قرآن' صاحب اسے مضحکہ خیز قرار دیں، لیکن اگر اسی حقیقت کو وہ خود 'عبوری دور کے احکام' کے حوالہ سے بیان کریں، تو وہ مفسر قرآن کہلائیں، حالانکہ ناسخ ومنسوخ کا لفظ نہ سہی، اس لفظ کے مادہ سے چند مشتقات، قرآن میں موجود ہیں، جبکہ 'عبوری دور کے احکام' کا کسی درجہ میں بھی، قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ پھر پرویز صاحب خود تو عمر بھر ناسخ ومنسوخ کے مسئلے پر زبانِ طعن دراز کرتے رہے لیکن ناسخ ومنسوخ کی حقیقت کو 'عبوری دور کے احکام' کے لیبل کے تحت خود تسلیم کرتے رہے

[۲۵] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء، ص ۹۴

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ آخر یہ واضح تو کیا جائے کہ علمائے کرام کے تصورِ ناسخ ومنسوخ میں اور خود 'مفکرِ قرآن' صاحب کے 'عبوری دور کے احکام' کے تصور میں کیا جوہری فرق ہے کہ اگر اس کو ایک نام سے موسوم کیا جائے تو ناقابل قبول قرار پائے اور دوسرے نام سے پیش کیا جائے تو قابل قبول؟ کیا یہ محض ایک لفظی نزاع نہیں ہے؟ جس کی آڑ میں 'مفکرِ قرآن' صاحب نے، صرف اور صرف علمائے امت کی تحقیر وتوہین اور ان کی تضلیل وتذلیل کے لئے عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کا اکھاڑا عمر بھر جمائے رکھا۔

اور پھر مقالہ نگار نے اپنی جذباتی ترنگ میں جس میں قدرے طنز کی تلخی بھی موجود ہے، فرمایا کہ — ''لیکن اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ کون سی آیت، کس آیت سے منسوخ اور کون سی آیت، کس آیت کی ناسخ ہے۔ یہ ناسخ ومنسوخ آیات کی نشاندہی روایات کے ذریعہ، ہمارے مفسرین کرام نے کی ہیں۔'' اب کوئی شخص پلٹ کر یہی سوال خود آپ سے یا جن کے آپ مقلد ہیں اُن سے پوچھ بیٹھے تو نہ معلوم آپ کا جواب کیا ہوگا، کہ حضرت گرامی قدر! اللہ تعالیٰ نے تو ان آیات کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ کون سی آیات 'عبوری دور کے احکام' سے متعلق ہیں اور کون سی آیات 'نظامِ ربوبیت کے تکمیلی دور' سے وابستہ ہیں؟ کیا بیچاری یہ آیات ایسی ہی قسمت کی ماری ہوئی تھیں کہ چودہ صدیوں تک گوشۂ خمول میں پڑی رہیں یہاں تک کہ بٹالہ کے ایک 'خالص عرب' علاقے میں ایک 'خالص عربی مفکر قرآن' پیدا ہوا، جس نے 'عجمی سازش' کے تحت قرآن کریم پر 'ملاؤں' کے ڈالے ہوئے پردے چاک کئے تو 'عبوری دور کے احکام' سے متعلقہ آیات اُبھر کر سامنے آ گئیں، تو 'مفکر قرآن' نے 'انکشافِ حقیقت' کرتے ہوئے فرمایا:

''وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ وخیرات وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے معاشرہ گزر کر، انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔''[۲۸]

وحی خفی اور مقالہ نگار

مقالہ نگار صاحب نے وحی خفی کے اہم مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے ہوئے ایک مقام پر یہ لکھا ہے کہ

''وحی خفی کا عقیدہ ہمارے علماء کرام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، صدرِ اول میں اس عقیدہ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ تقریباً دوسو سال کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا۔''[۲۹]

www.KitaboSunnat.com

إنا لله وإنا إليه راجعون بہرحال، اس سے اگلے صفحہ پر مقالہ نگار، مزید فرماتے ہیں کہ
''لیکن جو اصل موضوع ہے اور جو سب 'منکرین حدیث' کا اصل الاصول اور عروۃ الوثقیٰ ہے کہ حدیث وحی نہیں ہے اور ''وحی صرف قرآن میں ہے'' اس موضوع پر کچھ تحریر کرنے سے ہمارے علماء کرام ہمیشہ بچتے رہے اور اجتناب کرتے رہے ہیں۔''[50]

''ہمارے علمائے کرام، حدیث کو وحی ثابت کرنے کے لئے مضمون تحریر کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں، تاحال کسی رسالہ یا کتاب یا 'محدث' میں ایسا مضمون تحریر نہیں کیا گیا جس میں حدیث کو وحی خفی ثابت کیا گیا ہو، اس مضمون میں پھر اسی درخواست کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام، حدیث کے وحی ہونے پر کوئی ایسا جامع ومبسوط مضمون تحریر فرمائیں کہ نام نہاد 'منکرین حدیث' کو اپنے موقف پر دوبارہ غور کرنے کا موقع فراہم ہو۔''[51]

منکرین حدیث کے 'قرآنی فضائل اخلاق' میں سے ایک بینظیر وصف یہ ہے کہ اگر آپ ایک مسئلہ کو بیسیوں مرتبہ بھی وضاحت سے بیان کردیں تو بھی وہ یہی رٹ لگائے جائیں گے کہ ''اب تک کسی نے اس مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالی۔ نہ معلوم، علمائے کرام اس مسئلہ کو واضح کرنے سے کیوں گریزاں ہیں۔'' اور پھر جو یاے حق بن کر بڑے ہی معصوم انداز میں درخواست کریں گے کہ ''کوئی جامع ومبسوط مضمون تحریر فرمایا جائے۔''

حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر تجاہل عارفانہ سے کام لے کر یہ کہا گیا ہے کہ ''کسی رسالہ یا کتاب میں وحی خفی کے متعلق دلائل نہیں دیے گئے۔'' حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی کا مسلک چھوڑ کر، ہوا پرستی اختیار کرنے والے خودغرض لوگوں کو کہیں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملا کرتی جو ان کے فکر ومزاج کے خلاف ہو۔ مقالہ نگار، اگر واقعی اس مسئلہ کی کھوج کرید میں مخلص ہوتے تو ان کی رسائی اس قلمی مناظرے تک ضرور ہوجاتی جو طلوعِ اسلام کی فکر سے وابستہ ایک نمایاں فرد ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مولانا مودودی کے درمیان واقع ہوا تھا اور جس کی پوری روداد ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۶۱ء میں اور پھر بعد ازاں 'سنت کی آئینی حیثیت' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اس قلمی مناظرہ میں منکرین حدیث کے جملہ دلائل کا (بالخصوص وحی خفی پر اعتراضات کا) ایسا مسکت اور اطمینان بخش اور ایمان افروز جواب دیا گیا تھا (اور ہے) جو بہت سی بھٹکتی ہوئی شخصیتوں کے لئے باعثِ ہدایت ثابت ہوا تھا (اور ہے) یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کے پرزور استدلال کی اثر آفرینی سے اپنے قارئین کو بچائے رکھنے کی غرض

[50] طلوع اسلام، اگست ۱۹۳۹ء، ص ۸۳

www.KitaboSunnat.com

سے طلوعِ اسلام اس دوطرفہ قلمی مراسلت کو اپنے صفحات میں شائع کرنے کی جرأت نہ کرسکا، حالانکہ اس سے قبل ڈاکٹر عبدالودود صاحب وعدہ کر چکے تھے کہ اس پوری دوطرفہ خط و کتابت کو شائع کیا جائے گا۔ نیز اس کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوجائے گی کہ ''جواب نہیں ملا'' کی رٹ لگانا جملہ منکرین حدیث کی عام روش ہے!!

جہاں تک ماہنامہ 'محدث' یا دیگر دینی جرائد کا تعلق ہے تو ان میں بھی حدیث کے وحی ہونے کے بارے میں بیسیوں مضامین شائع کئے جاتے رہے ہیں جس پر محدث کے فتنہ انکارِ حدیث میں اس موضوع پر شائع ہونے والے ۷۰۰ کے لگ بھگ مقالات کی فہرست شاہد ہے۔ بطورِ خاص اس عنوان پر کہ 'حدیث وحی ہے اور اس کا منکر کافر ہے' محدث میں اکتوبر ۱۹۹۵ء (ج ۲۷/ عددا) میں دو طویل مقالات جناب غازی عزیر مبارکپوری کے قلم سے شائع ہو چکے ہیں۔

معیارِ صحت حدیث اور مقالہ نگار

مقالہ نگار صاحب دیگر منکرین حدیث کی ہم نوائی میں حدیثِ رسولؐ کی صحت کا واحد معیار بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

''جو حدیث قرآن کے مطابق ہو، اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔''[۵۲]

ہم پوچھتے ہیں کہ کسی حدیث، کسی قول، کسی بات یا کسی بھی معاملے کی صحت اور قبولیت کا واحد معیار اگر اس کا 'مطابق قرآن' ہونا ہی ہے تو اس میں آخر حدیثِ رسولؐ ہی کی کیا تخصیص ہے۔ زید کا خیال ہو یا بکر کا، جان مائیکل کا قول ہو یا رام داس کا، نتھا سنگھ کی بات ہو یا پرویز کی، الغرض کسی کا بھی کوئی خیال، فکر یا قول ہو اگر وہ 'مطابق قرآن' ہے تو صحیح، درست اور قابل قبول ہے۔ اس میں پھر فرمانِ نبیؐ ہی کی تخصیص کیوں؟ اور کس لئے؟ کیا اگر ابوجہل یا ابولہب کی کوئی بات 'مطابق قرآن' ہو تو آپ اسے یہ کہہ کر رد کردیں گے کہ یہ کافروں کی بات ہے؟ ابوجہل اور ابولہب تو خیر انسان ہی تھے اگر کوئی (بندر جیسا) جانور☆ بھی ایسی گفتگو کرے جو 'مطابق قرآن' ہو تو کیا آپ صرف اس لئے ردّ کردیں گے کہ یہ الفاظ ایک جانور کے منہ سے نکلے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جب آپ کے نزدیک صحت کی کسوٹی اور قبولیت کا معیار صرف اور

---

[۵۲] اقبال اور علماء پاک و ہند از اعجاز الحق قدوسی، ص ۸۲ تا ۸۳

www.KitaboSunnat.com

صرف 'مطابق قرآن' ہونا ہی ہے تو پھر ہر وہ بات جو اس معیار اور اس کسوٹی پر پورا اُترتی ہے، وہ صحیح بھی ہوگی اور قابل قبول بھی۔ اور جو چیز اس پیمانے پر پوری نہیں اُترتی وہ غلط بھی ہوگی اور مردود بھی، خواہ کسی پیغمبر نے پیش کی ہو یا غیر نبی نے، مسلمان نے پیش کی ہو یا کافر نے، فرد بشر نے پیش کی ہو یا کسی بندر نما جانور نے۔ اس اعتبار سے خدا کا رسول اور عام آدمی، فرد کافر اور بندۂ مومن، یہودی اور عیسائی، مجوسی اور ہندو، سکھ اور پارسی، سب کے سب ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ اس بظاہر خوش آئند معیار کا منطقی اور لازمی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو ان کے بلند مقام و منصب سے گرا کر عام فرد بشر کی سطح تک ہی نہیں، بلکہ مقام انسانیت سے بھی نیچے پھینک جائے۔ ع چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست

اگر میری صاف گوئی ناگوارِ خاطر نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ ''قرآن اور صرف قرآن کے ساتھ مطابقت'' کا یہ بظاہر خوش آئند اُصول گھڑا ہی اس لئے گیا ہے کہ مغرب کی فکری غلامی میں مبتلا ہو کر جو بات بھی من کو بھا جائے، اسے یہ کہہ کر قبول کرلیا جائے کہ یہ 'مطابق قرآن' ہے۔ چنانچہ اس اُصول (مطابقت قرآن) سے دوہرا کام لیا گیا، اوّلاً یہ کہ احادیث رسول سے جان چھڑانے کے لئے 'ردّ و ترک' کی راہ یہ کہہ کر ہموار کی گئی کہ

''ہمارے نزدیک، دین کا معیار، فقط کتاب اللہ ہے۔ جو عقیدہ یا تصور اس کے مطابق ہے، وہ صحیح ہے اور جو اس کے مطابق نہیں وہ بلا تامل و تذبذب، غلط اور باطل ہے۔ خواہ اس کی تائید میں ہزاروں حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کردی جائیں جس کے راویوں میں جبرائیل و میکائیل تک کا نام بھی شامل کردیا گیا ہو۔''[59]

لیکن 'مطابقت قرآن' کے اُصول کی آڑ میں تو یہاں صرف 'ردّ و ترک' کی راہ ہی ہموار کی گئی ہے۔ مزید رد و ترک سے خواہ وہ فرمودات نبیؐ ہی کا رد و ترک کیوں نہ ہو، بات نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے تو 'اخذ و قبول' کی راہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ راہ یوں ہموار کی گئی:

''ہر معقول بات خواہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی ہو یا کارل مارکس کی، اگر قرآن کی کسوٹی پر سچی ثابت ہوتی ہے، تو اُسے قبول کرنے میں عار نہ ہونی چاہئے۔''[60]

یہاں، ابوحنیفہ کا نام تو محض وزن برائے بیت کے لئے ہے۔ اصل میں تو کارل مارکس اور دیگر یہودی دانشوروں، عیسائی سکالروں، ملحد فلاسفروں، بے دین علماے مغرب سے استفادہ

[59] طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء ص ۳۷ [60] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۷۵

کرنا مقصود ہے۔ اور یہ استفادہ یہ کہہ کر کیا بھی گیا کہ جو فکر، جو خیال، جو قدر، جو اطوار ہم اپنا رہے ہیں وہ 'مطابق قرآن' ہے اور مغرب کی جس چیز کو 'مطابق قرآن' قرار دے کر قبول کرنے کی گنجائش نہ نکل سکی، اسے یہ کہہ کر اپنا لیا کہ ''یہ خلافِ قرآن نہیں ہے۔''

تہذیبِ جدید اور تمدنِ مغرب کی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کی اس کیفیت کے ساتھ جب یہ لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یورپ کی عینک لگا کر۔ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یورپ کے فلسفہ وفکر کو، سائنسی تحقیقات اور ایجادات کو اور معاشرتی طور طریقوں کو قرآن کی آیات سے ثابت کیا جائے اور اس طرح قرآن کا ایک 'نیا اعجاز' دنیا کو دکھا دیا جائے کہ دیکھو! سائنس کے میدان میں آج یورپ جو کشفِ حقائق کر رہا ہے اور اس کی بنیاد پر جو ایجادات وہ سامنے لا رہا ہے، آج سے چودہ سو سال قبل قرآن مجید ان کی طرف اشارے کر چکا ہے اور فلاں آیت سے تو فلاں تحقیق جدید صاف طور پر نکل رہی ہے اور ان ان آیات سے تو آج کے معاشی نظاموں میں سے فلاں معاشی نظام تو بالکل قرآن کے اقتصادی نظام سے متماثل ہے اور ان آیات سے تو واضح طور پر ان بہت سی معاشرتی عادات واطوار کی تائید ہو رہی ہے، جو آج کی ترقی یافتہ اقوام میں موجود ہیں اور معمولی سے چند اُمور کی اگر قرآن تائید نہیں کرتا تو اُنہیں یہ کہہ کر قبول کر لیا جاتا ہے کہ یہ خلافِ قرآن نہیں ہیں۔

قرآن کے نام لیوا یہ غلام فطرت حضرات اگرچہ اپنے آقایانِ مغرب سے سیاسی آزادی پا چکے ہیں لیکن ان کی فکری غلامی اور ذہنی اسیری سے چھٹکارا نہیں پا سکے ؎

وطن تو آزاد ہو چکا ہے، دماغ و دل ہے غلام اب بھی
پئے ہوئے ہیں شرابِ غفلت، یہاں کے خواص و عوام اب بھی

چنانچہ ان لوگوں نے ڈارون کا پورا نظریۂ ارتقا قرآن کے مختلف مقامات کی متفرق آیات کے ٹکڑوں کو جوڑ جاڑ کر معنوی تحریف کے حربوں کے ساتھ قرآن ہی سے برآمد کر لیا ہے، دورِ حاضر کے چلتے ہوئے دو بڑے معاشی نظاموں میں سے کارل مارکس اور لینن کی اشتراکیت کو قرآن کے جعلی پرمٹ پر وَر کر لیا ہے۔ تہذیبِ مغرب کی فاسد معاشرت کے جملہ اطوار واقدار کو بھی یہ کہہ کر اپنایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ 'مطابق قرآن' ہے۔ مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب، مرد وزن کی مطلق مساوات (بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نظریۂ افضلیت اُناث)، درونِ خانہ فرائض نسواں کی بجائے انہیں بیرونِ خانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعددِ ازواج کو

معیوب قرار دینا، عورت کو خانگی مستقر سے اُکھاڑ کر اسے مردانہ کارگاہوں کی طرف دھکیل دینا، خانگی زندگی میں عورت کے فطری وظائف سے اسے منحرف کر کے قاضی و جج بلکہ سربراہ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ سب کچھ قرآن میں سے نچوڑ ڈالنے کی دانشورانہ سرگرمیاں مغرب کی اندھی تقلید کے منہ بولتے کرشمے ہیں اور یہ سب کچھ کرتے ہی یہ لوگ مطمئن ہوجاتے ہیں کہ قرآنِ کریم دورِ حاضر کی ضروریات کا ساتھ دے رہا ہے، لہٰذا اب اسے 'تاریک دور' کی کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن قرآنِ مجید کے یہ نادان دوست ہرگز یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ دماغ سوزی نہ قرآن کے لئے مفید ہے اور نہ ہی اسلام کے لئے۔ یہ سب کچھ عوامی سطح کے مسلمانوں کے لئے محض دل خوش کن ہو تو ہو، مگر قرآن اور اسلام کی تبلیغی روح کے لئے سخت مضر ہے، اہل نظر اور دانایانِ اسلام کے لئے یہ روش سخت شرمندگی کا باعث ہے، اس لئے کہ ان لوگوں کی ان مقفّٰی اور مسجع لفاظیوں کو دیکھ کر اہل یورپ یہ کہہ سکتے ہیں بلکہ شاید اپنے دلوں میں کہتے بھی ہوں (کیونکہ ایسی باتوں کا برملا اظہار ان کی سیاسی مصلحتوں کے منافی ہوتا ہے) کہ "اب فلسفہ وسائنس کے یہ حقائق اور دورِ حاضر کا یہ معاشی نظام، نیز ترقی یافتہ اقوام کے یہ معاشرتی اطوار واقدار یہ سب کچھ تمہاری کتاب میں پہلے سے موجود ہے، اور بقول تمہارے اس کتاب میں واضح اشارات موجود ہیں اور تمہارے ہر طبقہ کے لوگ اس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں۔ دن رات اس کتاب کو سینوں میں محفوظ کرنے اور تلاوت کرنے میں منہمک رہے ہیں، مگر یہ حقائق تمہارے کسی عالم کو نظر نہ آئے اور ہم لوگ بغیر تمہاری اس کتاب کو پڑھے ان حقائق کو پاگئے ہیں اور ان میں مہارت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ہم نے دن دگنی رات چوگنی ترقی بھی کی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اس کتاب کی ضرورت ہو تو ہو، ہمیں تو اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کے لئے بھی یہ کتاب بیکار ہی ہے، اس لئے کہ آپ کو بھی جو ہمارے سائنسی حقائق، فلسفیانہ نظریات، اشتراکی نظامِ معیشت اور معاشرتی اصول واقدار اب اس کتاب میں دکھائی دینے لگے ہیں تو وہ بالفعل ہمارے ان چیزوں کو اپنا لینے کے بعد ہی نظر آنے لگے ہیں۔"

یقیناً ہمارے 'مفکرِ قرآن' صاحب نے بڑی ہی زحمت کشی اور محنتِ شاقہ کے ساتھ پچاس سالہ 'قرآنی خدمات' کی گولڈن جوبلی پائی مگر اس کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو کچھ وہ

قرآن سے نچوڑ کر پیش کرتے رہے ہیں وہ بغیر کسی 'قرآن' کے اہل مغرب کے ہاں پہلے ہی سے اپنایا جاچکا ہے۔ کبھی مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آیا کرتی تھی کہ ماضی میں کچھ لوگ اسلامی تعلیمات کی موجودگی میں کس طرح بیرونی افکار ونظریات کا شکار ہوئے تھے۔ منکرین حدیث اور خصوصاً پرویز صاحب کا لٹریچر پڑھ کر اب یہ بات بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ بیرونی فکر وفلسفہ سے مرعوبانہ حد تک مسخر دل ودماغ کن حیلوں اور حربوں سے کام لے کر اپنے من پسند اصول واقدار اور عادات واطوار کو 'مطابق قرآن' قرار دے کر قبول کیا کرتے ہیں۔

کسی چیز کے 'مطابق قرآن' قرار پانے یا نہ پانے کا فیصلہ ہمارے 'مفکر قرآن' کی وہ 'قرآنی بصیرت' کیا کرتی تھی جو سوچ وبچار کے ہر جھونکے کے ساتھ مرغ بادنما کی طرح بدلتی رہتی تھی اور یوں ہر بدلتے ہوئے 'قرآنی مفہوم' کے ساتھ، 'مطابق قرآن' ہونے کا معیار بھی بدل جایا کرتا تھا جس کے نتیجہ میں ایک وقت کے 'قرآنی افکار' دوسرے وقت میں 'غیر قرآنی' قرار پاجاتے تھے، اور بعض اوقات تو یہ فرق کفر واسلام کا فرق بن جاتا ہے یوں 'مطابقت قرآن' کے گرگٹ کی طرح بدلتے ہوئے معیار نے 'مفکر قرآن' کے لٹریچر میں تضادات وتناقضات کا وسیع وعریض خارزار پیدا کردیا۔

.....کو 'مطابق قرآن' بنانے کا نعرہ

یہ لاتعداد تناقضات وتضادات جنہیں شاید ضبط تحریر میں لانا، اس لئے مشکل ہے کہ ع ''سفینہ چاہئے، اس بحر بیکراں کے لئے'' اُن کی پریشاں خیالی اور ذہنی ابتری پر دلالت کرتے ہیں لیکن وہ ژولیدہ فکری کی اس حد تک پہنچ کر رک نہیں گئے تھے، بلکہ انہوں نے ایک ایسا نعرہ لگایا جسے اگر اُمت مسلمہ قبول کرلے تو پورے کا پورا اسلامی سرمایہ (قرآنِ مجید سمیت) اس ژولیدہ فکری کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ دراصل ان کا مقصود ومطلوب بھی تھا۔ چنانچہ وہ اپنے اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے سب سے پہلے تاریخ کو ہدف بناتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری غلط تاریخ ہے''[55]

لہٰذا اس غلط تاریخ کو صحیح کرنا بہت ضروری ہے اور اس کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے 'مطابق قرآن' بنایا جائے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں تاریخ کے علاوہ احادیث، فقہ،

---

[55] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۱۰

تصوف اور لغت الغرض ہر چیز ہی 'مطابق قرآن' کرڈالنے کا اعلان کیا جاتا ہے:

"سچ پوچھئے تو پوری اسلامی تاریخ نیز فقہ، احادیث، تصوف اور لغت سب پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔"(۵۶)

آخر یہ تبدیلی کس 'مفہوم قرآن' کے مطابق؟

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پرویز صاحب نے اس قدر متضاد اور متناقض 'قرآنی مفاہیم' پیش کئے ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو اچھا خاصا ضخیم موسوعہ تیار ہو جائے۔ جس 'مفکر قرآن' کی 'قرآنی بصیرت' دو ٹکے کی جنتری کی طرح ہر سال بدل جایا کرتی ہو، اور ہر مقام پر، ایک نیا 'قرآنی مفہوم' پیش کر ڈالتی ہو، تو اُن کے ان متخالف و متضاد 'مفاہیم قرآن' میں سے کس مفہوم کو معیار قرار دے کر کتب احادیث اور کتب تواریخ کا ازسرنو جائزہ لیا جائے؟ ایک منکر حدیث سے جب میری اس موضوع پر بحث ہوئی تو میں نے پرویز صاحب کی ابتدائی کتب اور بعد کی کتب سے جب درجن بھر متضاد 'مفاہیم قرآن' اس کے سامنے رکھے اور پھر اس سے پوچھا کہ ——"آپ کس وقت کے اور کون سے 'مفہوم قرآن' کو معیار قرار دے کر تاریخ، حدیث وغیرہ کو پرکھنا چاہتے ہیں؟ ایک 'مفہوم قرآن' کی رو سے جسے آپ صحیح قرار دیں گے، وہ پرویز صاحب ہی کے دوسرے مفہوم کے اعتبار سے غلط اور غیر قرآنی ہوگا" میرے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ "ہے کوئی جو اس سوال کا جواب دے"!!

پھر تضادات و تناقضات کے اس ذخیرہ میں—— ایک ایسا وقت بھی آیا کہ—— مزید کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ اس لئے نہیں کہ متفرق قرآنی مفاہیم میں سے کسی ایک مفہوم پر وہ مطمئن ہوگئے ہوں اور انتشارِ فکر کی بجائے، اتحادِ فکر کی منزل پر پہنچ گئے ہوں، بلکہ اس لئے کہ موت نے اُنہیں سطح زمین سے بطن ارض میں منتقل کردیا، ورنہ ہمیں یقین ہے کہ وہ ع

اگر اور جیتے ہوتے تو یہی 'انتشار' ہوتا

مقالہ نگار کا ایک اور سوال

مقالہ نگار، آخر میں ایک سوال اٹھاتے ہیں لیکن اس سے پہلے اس کی تمہید میں فرماتے ہیں کہ قرآن تبیانا لکل شیئ ہے۔ بیان للناس ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اس کی وضاحت کردی ہے کہ کذلك یبین الله آیته للناس اور اس طرح کی چند اور آیات پیش

(۵۶) طلوع اسلام، ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۶

کر کے سوال کرتے ہیں کہ

''اللہ نے فرما دیا کہ اپنی کتاب کی تبیین خود ہم نے کتاب کے اندر کر دی ہے تو پھر کتاب سے باہر مزید کسی تبیین کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تبیین کے بعد مزید تبیین کے کیا معنی؟''[1]

اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ سب سے پہلے منکرین حدیث کا اپنا طرزِ عمل اس کے منافی ہے یعنی جس کتاب کو وہ مفصّل، مُبِین، مُبَیّن اور تبیان کہتے ہیں، 'اللہ تعالیٰ کی تبیین کے بعد' خود تفسیر میں لکھ رہے ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ — ''ہم تو قرآن کے ایک مقام کی تفسیر'' تصریف آیات کے ذریعہ دوسرے مقام سے کرتے ہیں، لیکن اگر ان کی تفاسیر کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک مقام اور دوسرے مقام کے درمیان جو خلیج رہ جاتی ہے، اسے پُر کرنے کے لئے وہ اپنے ذہن و اجتہاد سے کام لیتے ہیں یعنی ربط مضامین اور استنباط نتائج میں قرآنی آیات کو اپنے فہم اور سمجھ کے مطابق چلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ برصغیر میں فتنۂ انکار حدیث نے صدیوں بعد جب سے سرسید کے ہاتھوں دوسرا جنم لیا، تب سے اب تک فہم قرآن یا تفسیر قرآن کے حوالہ سے جو کچھ بھی لکھا گیا وہ اس قدر باہم متضاد اور متخالف ہے کہ اس سے منکرین حدیث کے کئی فرقے بن گئے ہیں، حالانکہ سرسید نے ابتدا، اس دعویٰ سے کی تھی کہ مسلمانوں میں 'قرآن سے باہر' کی تعلیم سے جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، اُنہیں مٹانے کے لئے رجعت الی القرآن ضروری ہے، لیکن ہوا یہ ہے کہ جلد ہی یہ لوگ خود اختلاف سے بالاتر ہوتے ہوئے متحد و متفق ہو کر ایک جماعت بننے کی بجائے، متفرق فرقوں میں بٹ گئے ''جن میں قدرِ مشترک، صرف لفظ 'قرآن' ہے۔'' رہا مفہوم قرآن، تو وہ سب کا مختلف ہے۔ ہر فرقہ، بین، مفصل اور مبین قرآن کو کھینچ تان کر کے اپنے ذہنی تصورات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ کیا آج لاہور ہی میں بلاغ القرآن والوں اور طلوعِ اسلام والوں کی یہی کیفیت نہیں ہے؟

یہ تو رہی منکرین حدیث کے مختلف فرقوں کی کیفیت، خود پرویز صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس میں مفصل، مبین، مبین قرآن کی آیات کو فضائے دماغی میں اُٹھنے والی ہر لہر کے ساتھ اپنے تازہ ترین ذہنی مزعومات پر کھینچ تان کے ذریعہ منطبق کرتے رہے ہیں۔ ان کے وسیع خار

[1] طلوعِ اسلام، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۳۵

زار تضادات کی آخر اس کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اگر مقالہ نگار کے نزدیک ''اللہ کی تبیین کے بعد، مزید کسی تبیین کے کوئی معنی نہیں ہیں تو پھر 'مفکر قرآن' صاحب کی یہ 'تفسیر مطالب الفرقان'، یہ 'قرآنی فیصلے'، یہ 'قرآنی قوانین'، یہ 'تبویب القرآن'، یہ 'لغات القرآن'، یہ 'مفہوم القرآن' یہ سلسلہ ہائے 'معارف القرآن' وغیرہ کتب، اگر قتل اوقات (Time Killing) کی خاطر بھی نہیں تھی، تو پھر پیٹ کے جہنم کو ایندھن فراہم کرنے کی پیشہ وارانہ ضرورتوں ہی کا تقاضا تھا؟ کہ ع

روٹی تو کسی طور کما کھائے ہے مچھندر

رہا مقالہ نگار کے سوال کا دوسرا جواب تو اسے ہم جناب پرویز صاحب ہی کے قلم سے پیش کیے دیتے ہیں:

''اُصول و قانون کی کوئی کتاب خواہ کس قدر مفصل و مبین کیوں نہ ہو، اس کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے اور اس کے حقائق و رموز کی علت و غایت معلوم کرنے کے لئے اس کی تفصیل و تبیین کی ضرورت لابد ہوتی ہے۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: رکوع ۱) اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اُس کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ ان سے (احکام الٰہیہ) بیان کریں۔ رسول کو اس کی قوم کا ہم زبان بھیجنا، اس پر دلالت کرتا ہے (اور خود قرآن نے اس کی وضاحت کر دی ہے) کہ رسول کا فریضہ تبیین احکام بھی ہے، ورنہ اگر مقصود محض پیغام پہنچانا ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک عجمی شخص پر عربی میں قرآن نازل کر دیتا اور اس طرح قرآن کو عربوں تک پہنچا دیتا۔ اس شکل میں مصرحہ صدر آیت میں رسول کی جگہ، رسالت یا کتاب کا لفظ ہونا چاہئے تھا یعنی ''جس قوم پر کوئی کتاب یا پیغام بھیجتے ہیں وہ اسی کی زبان میں بھیجتے ہیں۔''[۵۸]

خلاصۂ بحث اور اس کا منطقی نتیجہ ـــــ 'اطاعتِ رسولؐ'

❶ اب تک کی اس طویل بحث سے یہ واضح ہے کہ

(ا) اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے باوجودیکہ وہ اس پر قادر مطلق تھا، اپنی کتاب براہِ راست لوگوں تک نہیں پہنچائی۔

(ب) خالق کائنات نے اپنے بندوں تک اپنی کتاب ہدایت پہنچانے کے لئے کسی فرشتے کو بھی

---

[۵۸] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۷۶

ذریعہ نہیں بنایا۔

ج) جس انسانی آبادی کو دعوتِ خداوندی کا اوّلین مخاطب بننا تھا اسی میں سے ایک بشر رسول کے ذریعہ کتاب پہنچائی۔

د) پھر رسول اور کتاب کی زبان بھی وہی تھی جو دعوتِ خداوندی کے اوّلین مخاطبین کی تھی۔

ہ) کتاب، خود اپنے بھیجنے والے کی نگاہ میں تبیین رسولؐ کی محتاج رہی ہے اور رسول، کتاب کا مامور من اللہ شارح اور ترجمان رہا ہے۔

ان پانچوں باتوں کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت انسانوں کی راہنمائی کے لئے کسی فرشتے کی بجائے انسان ہی کو رسول بنایا اور اسے کتاب دے کر اس قوم کی طرف بھیجا جو رسول کی ہم زبان تھی تاکہ وہ رسول، خالق کائنات کا نمائندہ مجاز ہونے کی حیثیت سے، اس کتاب کی جو توضیح وتشریح ان کے سامنے پیش کرے وہ ہم زبان ہونے کی بنا پر خوب سمجھ جائیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہے کہ تنہا زبان کی واقفیت، فہم کتاب اللہ کے لئے کافی نہیں ہے، جب تک کہ رسولؐ کی وضاحت اس کے ساتھ نہ ہو۔

کتاب لے کر، تشریح پیغمبر کو نہ لینا، نہ صرف یہ کہ تعلیم بلاعمل، کتاب بلاپیغمبر اور قرآن بلا محمدؐ کے نرالے مسلک کو اختیار کرنا، بلکہ اسی منصب رسالت کی تکذیب کرنا بھی ہے جس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ رسول کتاب کی تشریح وتفسیر اور تبیین وتوضیح کرے۔ اس کا انکار نفس رسالت ہی کا انکار ہے!!

❷ کتاب اللہ کے ساتھ، حضرت محمد ﷺ کا تعلق دو طرح کا ہی ممکن ہے:

اوّلاً۔ یہ کہ کتاب آپ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہو اور آپ بحیثیت رسول اس کتاب کی تبیین کے ذمہ دار ہوں۔ ہمارے نزدیک کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعلق کی یہی نوعیت ہے۔

ثانیاً۔ یہ کہ کتاب آپؐ کی تصنیف ہو اور آپؐ خود اس کتاب کے مصنف ہوں۔ کتاب اللہ کے ساتھ آپؐ کے اس تعلق کے قائل کفار عرب تھے۔ تاہم اگر کتاب اللہ کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کا تعلق، تصنیف اور مصنف کا تعلق ہی مانا جائے تب بھی اس تبیین وتفسیر کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں جو خود مصنف نے پیش کی ہے۔ خود مصنف کی اپنی تشریح کو چھوڑ کر کسی کا اپنی تشریح کرنا یا کسی تیسرے فرد کی تبیین کو تبیین مصنف کے مقابلے میں قبول کرنا انتہائی معقول

طرزِ عمل ہے۔

❸ قرآن کریم کی رو سے حضورِ اکرم ﷺ اُسوۂ حسنہ بھی ہیں، مگر ہر طرح کے تمام انسانوں کے لئے نہیں بلکہ صرف ان افراد کے لئے، ''جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتے ہیں اور یادِ خداوندی کو بکثرت مستحضر رکھتے ہیں۔'' ﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا﴾ اس آیت کی وضاحت میں خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''یہ آیت آپ اپنی تفسیر ہے یعنی ایک شخص جو خدا سے بہت ڈرتا ہے اور اسے یقین ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں کیا جاتا ہے، ایک دن خدا کے حضور پہنچ کر اس کی جوابدہی ضرور ہوگی۔ اب جس شخص کا یہ ایمان و یقین ہو لامحالہ وہ یہی چاہتا ہے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ کون سی شاہراہِ حقیقت ہے جس پر گامزن ہو کر وہ اس منزل مقصود کو پالے گا اور ادھر ادھر ضال ومغضوب (ذلیل وخوار) نہیں ہوتا پھرے گا۔ اس لئے فرمایا کہ تردد کی کیا ضرورت ہے، رسول کی زندگی کا نمونہ سامنے ہے، اس ہادیٔ صراط مستقیم کے نقوش قدم موجود ہیں۔ بلاخوف وخطر ان نشانوں پر چلتے جاؤ، کسی قسم کا بھی خوف وخطر نہ ہوگا۔''[59]

❹ قرآن نے جگہ جگہ اطاعتِ رسول کا حکم دیا ہے۔ منکرین حدیث، رسول کی حیثیت ایک ڈاکیے سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ وہ حیثیتِ رسالت کو صرف 'پیغام پہنچا دینے' کی حد تک محدود جانتے ہیں، حالانکہ تبلیغ رسالت ایک الگ فریضہ ہے اور اطاعت رسولؐ ایک الگ چیز ہے۔ تبلیغ رسالت (اور تبلیغ قرآن میں) اطاعتِ رسول کا حکم بھی شامل ہے۔ یہ اطاعت رسول، منکرین حدیث کے لئے بہت بڑی وجہ پریشانی ہے۔ چنانچہ وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اطاعتِ رسول کا معنی، اطاعتِ خداوندی ہی ہے جس کی عملی شکل کتاب اللہ کی پیروی ہے۔ لیکن یہ بات پھر ان کے لئے دردِ سر بن جاتی ہے کہ قرآنِ کریم میں اتباعِ قرآن کا الگ ذکر ہے اور اطاعتِ رسول کا الگ حکم ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ قرآنِ مجید کو کہیں بھی اُسوۂ حسنہ نہیں کہا گیا، جبکہ رسول اللہ (کی زندگی) میں اہل مسلمان کے لئے بہترین اُسوہ کا ذکر کیا گیا ہے لیکن منکرین حدیث یہاں دلیل کی بجائے، ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے باصرار یہ کہے چلے جاتے ہیں کہ رسول کی اطاعت، اصلاً اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اللہ کی اطاعت کی عملی صورت صرف یہ ہے کہ کتاب اللہ کی پیروی کی جائے۔ یوں یہ لوگ اللہ کی اطاعت کی عملی صورت میں، اطاعتِ رسولؐ کی اس کڑی کو خارج کر دیتے ہیں جس کی وساطت سے کتاب

---

[59] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۷۹ تا ۲۸۰

اللہ، اہل ایمان کو ملی ہے۔ چنانچہ پرویز صاحب فرماتے ہیں:

''اطاعت اور حکومت صرف خدا کی ہوسکتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں ہوتا، ہم اس کے احکام کو براہِ راست سن نہیں سکتے، اس لئے اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ یہ اطاعت اس کی کتاب کی مدد سے کی جائے، جسے اس نے نازل کیا ہے۔''[1]

یہی منکرین حدیث کی وہ اصل گمراہی ہے جس پر وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ بات کہاں فرمائی ہے کہ: ''اس کی اطاعت، اس کتاب کی مدد سے کی جائے جسے اس نے نازل کیا ہے۔'' کیا قرآن نے کہیں بھی یہ کہا ہے کہ من یتبع القرآن فقد أطاع اللہ ''جس نے کتاب اللہ کی پیروی کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' آخر خود سوچئے کہ یہ خداوند قدوس اور اس کی کتاب پر بہتان تراشی ہے یا مزاج شناسی اُلوہیت؟ اس کے برعکس قرآن میں یہ مذکور ہے کہ ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾ ''جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی'' اور یہ بھی قرآن میں مذکور ہے کہ ایمان کا تقاضا بھی اور نتیجہ بھی، اللہ سے گہری محبت کا ہونا ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لله﴾ ''ایمان والوں کی محبت، سب سے زیادہ اللہ سے ہوتی ہے'' اور پھر یہ بھی قرآن میں مذکور ہے کہ محبتِ الٰہیہ کا تقاضا اتباعِ رسول ہے۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾ (آل عمران:۳۱)

''(اے نبی!) فرما دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا اور تمہارے گناہ معاف کر ڈالے گا۔''

اور یہ قاعدہ کلیہ بھی، قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللهِ﴾ (النساء:۶۴)

''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، وہ اس لئے بھیجا ہے کہ باذن اللہ اس (رسول) کی اطاعت کی جائے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اطاعتوں کے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اور کتاب اللہ کے درمیان، اطاعتِ رسول کی کڑی کو خارج کر ڈالنا اور یہ سمجھنا کہ اطاعتِ رسول کے بغیر بھی کتاب اللہ کی پیروی ممکن ہے، قطعی محال ہے، ایسے لوگوں کو پاداشِ عمل سے ڈرنا چاہئے!!

---

[1] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۵۱

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (النور:۶۳)

''پس ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، اس بات سے کہ ان پر کوئی فتنہ یا دردناک عذاب ٹوٹ پڑے۔''

اور اس لئے کہ اطاعتِ رسول سے دست کش ہونا اپنے اعمال کو برباد کر دینا ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ﴾ (محمد:۳۳)

''اے اہل ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ بناؤ''

اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے، آخر میں، جناب پرویز صاحب ہی کا ایک اقتباس نذرِ قارئین کر رہا ہوں:

''اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں کتبِ سماوی اور حضرات انبیا کرام کی تشریف آوری کا سلسلہ اس غرض و غایت کے لئے ہے کہ دنیا میں انسان خدا کا فرماں بردار بن کر جیئے۔ گویا انسانی زندگی کا مقصود بالذات 'اطاعتِ خداوندی' ہی ہے، لیکن چونکہ خدا ہر ایک کے سامنے نہیں آتا، نہ ہر ایک سے کلام کرتا ہے۔ اس لئے انسانوں کو پتہ کیسے چلے کہ کس کام میں اس کی اطاعت ہے اور کس میں معصیت۔ اس کے لئے اس نے اپنے پیغامات علی التواتر دنیا میں بھیجے اور ان پر کاربند ہونے کا حکم فرمایا، تو گویا کتابوں پر عمل پیرا ہونا درحقیقت اطاعتِ خدا ہی تھا لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، کتاب بلاتعمیل یہ واضح نہیں کر سکتی کہ اس کے احکام پر کس شکل اور کس نوعیت سے عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس لئے انسانوں میں رسول منتخب کئے گئے تاکہ وہ ان احکام پر خود عمل پیرا ہو کر دوسروں کے لئے ایک اُسوہ قائم کریں، لہٰذا حکم دیا گیا کہ رسول کی اطاعت کرو۔ مقصودِ آخری یا منتہیٰ اگرچہ اطاعتِ خدا ہی تھا، لیکن بجائے اس کے کہ اس اطاعت کی شکل ہر ایک کی اپنی مرضی یا زیادہ سے زیادہ فہم و ادراک پر چھوڑا جاتا، حکم دے دیا کہ اپنی رائے کو دخل نہ دو، بلکہ جس طرح سے یہ رسول کر کے دکھاتا ہے یا کرنے کا حکم دیتا ہے اس کے مطابق کرتے جاؤ، یہی اطاعتِ خدا ہو جائے گی: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (۴/۸۰) ''جس نے رسول کا حکم مانا اس نے گویا خدا کی اطاعت کی۔''

چنانچہ انبیاءِ سابقہ کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنی اپنی قوم کو خدا کی اطاعت کا جو سبق دیا تو انہی الفاظ میں کہ ہماری یعنی رسولوں کی اطاعت کرو۔ سورۃ الشعراء میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ سے یہ الفاظ مذکور ہیں: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ ''اللہ سے ڈرو اور میری تابعداری کرو۔''

بعینہٖ یہی الفاظ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی زبان سے، اسی جگہ مذکور ہیں، چنانچہ اسی حقیقت عظمیٰ کو قرآن نے اجتماعی طور پر بطورِ حصر، ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللهِ﴾ ''ہم نے ہر رسول کو اس لئے بھیجا کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

گویا رسول کی اطاعت، خدا کے حکم سے ہے، لیکن اطاعت اس کی ضرور ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ حکم دیا ہے کہ ﴿اِتَّبِعُوْا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (اعراف:۱۰۸) ''اُس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔''

اور کہیں نجات وسعادت کو اتباعِ رسول عربی کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی دعا کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری قوم میں سے ہماری رحمت ان کے ساتھ ہوگی: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْانْجِيْلِ﴾ (اعراف:۱۵۷) ''جو اتباع کریں گے اس رسول و نبی اُمی کا جس کا ذکر یہ لوگ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ (نعوذ باللہ) ان احکام میں تضاد ہے کہ کہیں قرآن کے حکم کا اتباع ہے اور کہیں رسول کے اتباع کا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی قرآن کا اتباع ہے کیونکہ رسول کو خود حکم دیا گیا ہے کہ ﴿وَاتَّبِعْ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (احزاب:۲) ''اور جو تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر وحی کی جاتی ہے، اس کا اتباع کرو۔''

لہٰذا ان احکام کی موجودگی میں اب یہ کسی کی اپنی مرضی ومنشا کے ماتحت نہ رہا کہ جس طرح جی چاہے قرآن کا اتباع کرلے بلکہ قرآن کا اتباع ہو ہی اس شکل میں سکتا ہے جس شکل میں رسول نے کیا یا کرنے کا حکم دیا۔''[۶۱]

قدرے اور آگے چل کر پرویز صاحب لکھتے ہیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کے مجسمہ تعمیل قرآن اور اُسوۂ حسنہ کی حیثیت سے یوں استدلال کرتے ہیں:

''چونکہ اس تعمیل اور نمونہ کے بغیر خدا کی اطاعت ممکن نہ تھی، اس لئے جہاں قرآن کریم میں ﴿أَطِيْعُوْا اللهَ﴾ آیا ہے، اس کے ساتھ ہی ﴿أَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ﴾ بھی آیا ہے۔ کہیں ایک جگہ بھی اکیلا ﴿أَطِيْعُوْا اللهَ﴾ نہیں آیا اور چونکہ ﴿أَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ﴾ میں اطاعت خداوندی خود بخود آجاتی ہے، اس لئے خالی ﴿أَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ﴾ قرآن میں بعض جگہ آیا ہے، مثلاً ﴿وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (نور:۵۶) ''رسول کی اطاعت کرو

---

[۶۱] معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۰ تا ۲۸۲

تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اور جہاں جہاں ﴿أَطِيْعُوْا اللهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ﴾ آیا ہے، وہاں درحقیقت ﴿أَطِيْعُوْا اللهَ﴾ سے مراد اطاعتِ رسول ہی ہے۔''(۶۲)

منکرین حدیث اور ان کے 'بابا جی' اطاعتِ رسول کے ضمن میں جس طرح مختلف مواقع پر متضاد موقف اختیار کرتے رہے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک مثال یہ بھی ہے کہ دورِ ماضی میں جن آیات میں 'اللہ و رسول' کے بعد واحد کی ضمیریں آئی ہیں ان سے مراد وہ 'مرکزِ ملت' نہیں لیا کرتے تھے، بلکہ ان واحد کی ضمیروں کا مرجع، ذاتِ رسول ہی کو قرار دیا جاتا تھا۔ مثلاً ﴿أَطِيْعُوْا اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ﴾ (۸/۲۰) ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ﴾ (۸/۲۴) اور سورۃ النور کی یہ آیت ﴿قُلْ أَطِيْعُوْا اللهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ...... وَإِنْ تُطِيْعُوْهُ﴾ (۲۴/۵۴) وغیرہ

ملاحظہ فرمایئے، ان آیات میں مذکور انہی واحد کی ضمیروں کے بارے میں پرویز صاحب کیا فرمایا کرتے تھے:

> ''آیت نمبر۱ میں عنه کی ضمیر واحد غائب، نمبر۲ میں دعاکم اور نمبر۳ میں تطیعوه کے اضمارِ واحد سے، جن کا مرجع رسول ہے، عیاں ہے کہ رسول کی اتباع کا حکم ہے اور اس کی آواز پر حاضر ہونے کی تائید ہے اور اُس سے روگردانی سے منع کیا گیا ہے، پس اطاعتِ رسول عین اطاعتِ خدا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ﴾''(۶۳)

یہ اقتباسات، منکرین حدیث کے خلاف لکھے جانے والے اس مقالے سے مقتبس ہیں جو اس دور میں پرویز صاحب نے لکھا، جب وہ ذہناً اور قلباً حدیثِ نبوی اور سنتِ رسولؐ سے منحرف ہوچکے تھے لیکن مسلم عوام اور علماے کرام میں مقبولیت (Popularity) پالینے کے لئے وہ اپنے قلم سے ان ہی خیالات کو پیش کرنے پر مجبور تھے جو عامۃ الناس میں اور علماء کرام میں سلفاً و خلفاً مقبول تھے۔ ان خیالات کے اظہار کی غرض و غایت خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ خیالات بہرحال درست، صحیح، مطابق قرآن اور موافق اسلام تھے، لیکن بعد میں جب انہوں نے افکار و نظریات میں اُلٹی زقند لگائی تو ان کی پوزیشن بالکل وہی تھی جو الہلال والے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی پوزیشن، کانگریس میں شمولیت کے بعد ہوگئی تھی۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں اطاعتِ رسول کے حوالہ سے مندرجہ ذیل جملوں پر دوبارہ غور فرمایئے

① جس طرح سے یہ رسول کر کے دکھاتا ہے یا کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کے مطابق کرتے جاؤ۔ یہی اطاعت خدا ہوجائے گی!!

---

(۶۲) معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳ (۶۳) معارف، اپریل ۱۹۳۵ء، ص ۲۸۳ تا ۲۸۴

② اصل یہ ہے کہ رسول کا اتباع ہی قرآن کا اتباع ہے۔
③ قرآن کا اتباع ہو ہی اس شکل میں سکتا ہے کہ جس شکل میں رسول نے کیا یا کرنے کا حکم دیا۔
④ چونکہ ﴿أَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ میں اطاعت خداوندی خود بخود آ جاتی ہے، اس لئے ﴿أَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ قرآن میں بعض جگہ آیا ہے۔
⑤ پس اطاعت رسول، عین اطاعت خدا ہے۔

لیکن بعد میں اس بنیادی مسئلہ میں پرویز صاحب نے قلا بازی لگائی تو پھر ان کا تکیہ کلام ہی یہ بن گیا کہ — ''رسول کی اطاعت بھی کتاب کی پیروی کے ذریعہ ہوگی'' الفاظ کے تفاوت کے ساتھ اس بدلے ہوئے موقف کو بار بار دہرایا گیا۔ قبل از تقسیم برصغیر قرآن اور سنت رسول، دونوں ہی اسلام کے ستون تھے اور اُسوۂ رسول، قرآن سے باہر (احادیث میں بھی موجود تھا اور کتاب وسنت یا قرآن واُسوۂ رسول دونوں ہی اساس اسلام اور ماخذ احکام ومسائل تھے اور قرآن کی طرح اُسوۂ رسول کے احکام بھی ناقابل تغیر وتبدل تھے۔

''یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام دو قسم پر مبنی ہیں ایک تو وہ جن میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، ان کے لئے قرآن کریم کی نصوص صریحہ اور رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔...''[34]

لیکن پاکستان بنتے ہی آفتاب آزادی کے ساتھ جو طلوع اسلام ہوا تو اس میں سنت رسول اور اُسوۂ نبی ماخذ مسائل نہ رہے۔ ان کی دینی حیثیت ختم ہوگئی اور اُسوہ قرآن سے الگ کوئی چیز نہ رہا بلکہ محصور فی القرآن قرار پایا اور اسی طرح سنت بھی صرف قرآن ہی میں محدود ٹھہری یوں کتاب وسنت سے مراد صرف کتاب ہی ہوگئی:

① ''سنت بھی کتاب کے اندر ہے، باہر نہیں ہے۔''[35]
② ''کتاب وسنت سے مراد، اللہ کی کتاب ہے جس کی اتباع رسول اللہ نے فرمائی۔''[36]

اُسوۂ رسول اور سنت رسولؐ سے یوں یہ کہہ کر جان چھڑالی گئی کہ ''اُسوہ اور سنت سب کچھ قرآن ہی ہیں'' اور مغربی معاشرت کے جملہ عادات واطوار اور اشتراکیت کا پورا نظام اور فرنگی تہذیب کا ہر فکر اور فلسفہ جو من پسند ٹھہرا، اسے یہ کہہ کر قبول کرلیا کہ ''یہ مطابق قرآن ہے۔'' اور یوں اللہ تعالیٰ کے دین کی تکمیل ہوئی۔ فطوبیٰ لکم علی ما أکمل پرویز دینکم!

---

[34] طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۲۵
[35] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۱ء، ص ۲۱، ۱۶
[36] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۵۱ء، ص ۲۱، ۱۶